اسلام کا نظام محاصل

از : ڈاکٹر اسرار احمد

یہ مقالہ بتاریخ [illegible] جنوری [illegible]ء ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل لاہور میں جسٹس ذکاء الدین پال صاحب کی صدارت میں منعقدہ لائنز کلب لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا

©rasailojaraid.com

احمدہٗ واصلی علیٰ رسولہ الکریم ، اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

محترم صدر مجلس و صدر و اراکین لائنز کلب اور معزز حاضرین !

سب سے پہلے تو میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس منفرد اور منتخب مجلس کو خطاب کرنے کا موقع دیا۔ میں اسے اپنے لیے ایک اعزاز متصور کرتا ہوں اور اس پر آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے گفتگو کے لیے جو موضوع آپ نے دیا ہے اس میں کسی قدر ناانصافی کا معاملہ ہوا ہے، میرے ساتھ بھی اور موضوع کے ساتھ بھی۔ اس لیے کہ میں نہ معاشیات کے میدان کا آدمی ہوں نہ مالیات کا اور محاصل کا مسئلہ نہایت فنی نوعیت کا حامل اور بے حد پیچیدہ ہونے کے علاوہ بیک وقت معاشیات و مالیات دونوں سے متعلق ہے — ایک ایسا ہی لطیفہ حال ہی میں اور بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ جناب سید نزہت بخاری صاحب (چیف ایگزیکٹو حیدری انٹرنیشنل فائی نینس لمیٹڈ) نے حال ہی میں ایک مقالہ پڑھا جس کا موضوع تھا "Tax on income vs tax on produce and possession" — لیکن لطیفہ یہ کہ یہ مقالہ پیش کیا گیا پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کی شعبہ جاتی انجمن یعنی مجلس فلسفہ کے عہدیداروں کی حلف برداری کی تقریب میں — گویا وہاں موضوع کے اعتبار سے مقرر درست تھا لیکن

© rasailojaraid.com

سامعین غلط تھے ۔ یہاں مقرر تو یقیناً بالکل غلط ہے ، البتہ سامعین کے بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا ! ۔ بہرحال میں نے یہ گمان کیا کہ میرا انتخاب موضوع کے جزو ثانی کے اعتبار سے ہوا ہے یعنی " System of taxation in Islam " میں سے مجھ پر نگہ انتخاب اسلام کے ایک ادنیٰ خادم اور قرآن حکیم کے حقیر طالبعلم ہونے کی بنا پر پڑی ہے اور میرے لیے یہ بھی یقیناً ایک بڑا اعزاز ہے ۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ اصل روحِ دین اور نظامِ اسلام دونوں کے اعتبار سے اسلام میں نظام محاصل کے بارے میں جو کچھ میں سمجھ پایا ہوں ، آپ کے سامنے رکھ دوں !

" Taxation in Islam " کے الفاظ سے آپ سے آپ جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس اصطلاح کے وضع کرنے والوں کے نزدیک اسلام ایک ایسے نظام معیشت کا حامی ہے جس میں ذاتی ملکیت (Private ownership) اور آزاد معیشت (Free-enterprise) کو اصول موضوعہ کی حیثیت حاصل ہے ۔ اس لیے کہ اجتماعی یا قومی ملکیت کے اصول پر مبنی نظام معیشت میں تو سب کچھ حکومت ہی کی ملکیت پر ہوتا ہے لہٰذا محاصل کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا !

میں آغازِ گفتگو ہی میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ مفروضہ جزواً تو درست ہے کلیتہً صحیح نہیں ہے ۔ اس لیے کہ یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے اور اس سے پوری حقیقت سامنے نہیں آتی !

میرے نزدیک نظام معاشی کے اعتبار سے اسلام کے دو رُخ یا دو پہلو ہیں ، اور یہ دونوں ایک دوسرے پر بہت حد تک Interdependent ہیں ۔ اور اسلام کی برکات و ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اتصال و اجتماع ہی سے ہو سکتا ہے اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اگر ان میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل رہ جائے اور توجہ صرف ایک ہی پر مرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ بہت بعید از حقیقت ہوگی ۔ ان دو پہلوؤں سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام کا ایک اخلاقی و روحانی نظام ہے ۔ اور دوسرا قانونی و فقہی نظام ، ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں ، تاہم ان دونوں کے امتزاج ہی سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے ۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو " دعویٰ " (Thesis) اور " جوابِ دعویٰ "

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

(Anti-thesis) سے تعبیر فرمایں اور ان دونوں کے امتزاج کو Synthesis قرار دے لیں، بہرحال ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے!

ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز و کمزور ہیں اس لیے کہ اس صورت میں تو "قہرِ درویش برجانِ درویش" کے سوا اور کوئی صورت قابلِ عمل ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ بدلہ لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اسلام کا قانونی و فقہی نظام بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ" یعنی "اے ہوشمندو! تمہارے لیے قصاص ہی میں زندگی ہے!" لیکن دوسری طرف اسلام کی اخلاقی و روحانی تعلیمات ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے کو معاف کر دیا جائے، چنانچہ کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ "وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" یعنی "اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے۔" کہیں تشویق و ترغیب کے انداز میں فرمایا جاتا ہے "وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" یعنی "وہ لوگ جو غصہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں!" — دیکھ لیجئے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام و محل پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسنِ معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اسی پر قیاس کر کے سمجھ لیجئے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں؛ چنانچہ ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled capitalism) ہے۔ اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے۔ اگرچہ اسے "سرمایہ داری" بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری جانب اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں میں پورے انشراح صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت، (Spirtual socialism) ہے، اور ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے آگے کا تصور بھی ممکن نہیں اس لیے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت

© rasailojaraid.com

کا اثبات موجود ہے اگرچہ انفرادی نہیں اجتماعی — لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں ایمانی تعلیم کی رُو سے انسانی ملکیت کی کُلّی نفی کرتا ہے، چنانچہ قرآنِ حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ "لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ان سب کا مالک صرف اللہ ہے!" انسان کسی اور شئے کا مالک تو کیا ہوگا — خواہ وہ زمین ہو، مکان ہو، ساز و سامان ہو، روپیہ پیسہ ہو، وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں، اس کے ہاتھ پاؤں، اعضاء جوارح اور جسم و جان اور اس کی کُل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں بقول شیخ سعدیؒ ؎

"این امانت چند روزہ نزد ماست ؛ در حقیقت مالکِ ہر شئے خدا ست"

یا بقول علامہ اقبالؒ -

"رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست ؛ ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خدا ست!!"

اسلام کے اس روحانی سوشلزم کی رُو سے جس کا آغاز انسانی ملکیت کے تصور کی کُلّی نفی سے ہوتا ہے، اس دنیا میں انسان کا حق صرف اس کی ضروریات ہیں اور بس!!! — ضرورت سے زائد اس کے پاس جو کچھ ہے اس پر اس کو قانونی و فقہی حق حاصل ہو تو ہو حقیقی حق کوئی حاصل نہیں۔ یہ دراصل دوسروں کا حق ہے جسے اللہ نے صرف بطورِ امتحان اس کے تصرّف میں دیدیا ہے تاکہ دیکھے کہ آیا وہ اسے حقداروں تک پہنچا کر اور "حق بحقدار رسید" والا معاملہ کر کے سُرخ رُو ہوتا ہے یا دوسروں کے حق پر قبضۂ مخالفانہ جما کر بیٹھ رہتا ہے اور اس "قدرِ زائد" کے بل پر ابنائے نوع پر دھونس جماتا ہے اور شادیوں اور دوسری تقریبوں میں اس غصب شدہ دولت کو اللّوں تللّوں میں اُڑا کر محروموں کے زخمی دلوں پر اور نمک چھڑکتا ہے!! — اب جن کے دلوں میں ایمان واقعتاً راسخ ہو جاتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ان کا یقین محکم قائم ہو جاتا ہے اور ان کی نگاہ ہر دم "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" پر جمی رہتی ہے ان کی روش لامحالہ یہی ہوتی ہے جس کو قرآن نے واضح کیا ان الفاظ میں کہ "یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ!" — یعنی "(اے نبی) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں یعنی اللہ کی راہ میں کس حد تک دے ڈالیں (فرما دیجئے جو بھی زائد از ضرورت ہو!" — اور جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا اپنے

© rasailojaraid.com

اس شعر میں کہ ؎ جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

پھر یہ بھی کہ اسے اپنا کوئی احسان نہ سمجھو، بلکہ یہ تو تھا ہی دوسروں کا حق بفحوائے الفاظ قرآنی "وَفِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ!" — "ان کے مالوں میں معین حق ہے سائلوں اور محروموں کا!" اور "وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ" — اور ادا کرو قرابت داروں اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق! — اس کے برعکس جو لوگ اس کائنات اور خود اپنی ذات وحیات کی اصل حقیقتوں سے بالکل بے خبر ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں ان کی روش ہوتی ہے دوسری جس کا اوّلین نتیجہ ہے اسراف اور انتہائی منزل ہے تبذیر! — اسراف کہتے ہیں جائز ضرورتوں پر ضرورت سے زاید خرچ کرنے کو اور یہ بھی بہت معیوب ہے — جبکہ تبذیر ہے بالکل بلا ضرورت صرف نمود و نمائش اور اللّوں اور تللّوں میں روپیہ اڑانا اور یہ وُہ جرم ہے جس کے مرتکبوں کو شیطان کے بھائی قرار دیا گیا — بفحوائے الفاظ قرآنی "اِنَّ الۡمُبَذِّرِيۡنَ كَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّيٰطِيۡنِ!" یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ اعاذنا اللّٰہ مِنۡ ذَالِكَ ۔

الغرض اسلام کی روحانی واخلاقی — یا ایمانی تعلیمات کا حاصل اعلیٰ ترین اور عظیم ترین اور ہر اعتبار سے کامل ترین Spirtual socialism ہے، لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ دوسرے رُخ کے اعتبار سے اسلام کا نظامِ معیشت یقیناً ایک Controlled capitalism ہے۔ اس لیے کہ اسلام قانونی و فقہی اعتبار سے افراد کو زمین، مکان، ساز و سامان حتیٰ کہ ذرائع پیداوار تک پر ایسا حقِ تصرّف عطا کرتا ہے جو کم از کم ظاہری اعتبار سے حقِ ملکیت سے کامل مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حقِ تصرّف یا حقِ ملکیّت وراثتاً اولاد و احفاد کو منتقل بھی ہو سکتا ہے — الغرض، اپنے قانونی و فقہی نظام میں اسلام نے انسان کے جبلّی تقاضوں کو تمام و کمال ملحوظ رکھا ہے اور نجی ملکیّت (Private ownership)، ذاتی حوصلہ مندی (Personal incentive) اور آزاد معیشت (Free-enterprise) کے اصول سہ گانہ کو قانونی سطح پر برقرار رکھ کر "سرمایہ کاری" کے لیے وسیع میدان پیدا کر دیا ہے البتہ اس ضمن میں بعض نہایت اہم اور بنیادی اور حد درجہ مؤثر احتیاطی تدابیر ایسی اختیار کی ہیں

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں "صحت مند سرمایہ کاری" کی فضا تو قائم رہے، لیکن یہ "سرمایہ داری" کی صورت اختیار نہ کر لے۔ ان احتیاطی تا تحدیدی تدابیر کے بارے میں تفصیلی بحث میری موجودہ گفتگو کے موضوع سے خارج ہے، صرف اشارۃً عرض کر سکتا ہوں کہ سود یعنی (Interest) — سٹہ یعنی (Speculation) اور احتکار یعنی (Hoarding) وغیرہ کی حرمت کی اصل غرض و غایت یہی ہے جو میں نے بیان کی یعنی سرمایہ کاری "سرمایہ داری" نہ بن جائے، اور capitalism بہرحال Controlled رہے، — البتہ اس حقیقت سے انکار صرف ہٹ دھرمی ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ سرمایہ کاری خواہ کتنی ہی پابند کیوں نہ ہو فرق و تفاوت کہ [illegible] امراء یا اغنیاء (Haves) اور فقراء (Have-nots) کا وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی دوڑ میں دس افراد شریک ہوں اور خواہش یہ ہو کہ وہ سب برابر رہیں، نہ کوئی آگے بڑھے نہ پیچھے رہے تو اس کی تو ایک ہی صورت ممکن ہے، یعنی یہ کہ ان سب کو ایک رسّے سے باندھ دیا جائے۔ بصورتِ دیگر تو لامحالہ کوئی آگے بڑھے گا اور کوئی پیچھے رہ جائے گا! گویا اسلام کے قانونی و فقہی نظام میں "جبری مساوات" (Forced equality) کا کوئی وجود نہیں ہے — لیکن اتنی ہی بڑی اور اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اسلام کے نظامِ محاصل میں اسی فرق و تفاوت کے مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے مقصد کو اوّلین اور مقدم ترین اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اغنیاء اور فقراء کی تقسیم کو اعتباری یا عارضی یعنی (Arbitrary) نہیں رہنے دیا بلکہ اس کے لیے ایک باقاعدہ و باضابطہ حدِّ فاصل کھینچ دی ہے جسے اصطلاحِ شرع میں "نصاب" کہتے ہیں جس کا تعین اموال کی تقریباً تمام بڑی بڑی صورتوں میں کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ساڑھے سات تولے یا اس سے زائد سونے کا مالک اغنیاء میں شمار ہوگا، اور ساڑھے سات تولے سے کم رکھنے والا فقراء میں سے اور اسلام کے نظامِ محاصل کا اہم رکن یعنی زکوٰۃ اغنیاء سے لی جائے گی اور فقراء میں تقسیم کر دی جائے گی بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ اِلٰی فُقَرَاءِ هِمْ"! اور اس طرح وہ تمام تقاضے بتمام و کمال اور باحسن وجوہ پورے ہو جاتے ہیں جنہیں اس دور میں "اجتماعی ضمانت" — (Collective insurance) یا "سماجی تحفظ" (Social security)

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور اس سب پر مستزاد ہے وہ روحانی و اخلاقی اور ایمانی و احسانی تعلیم جو اسلام اپنے ہر ماننے والے اور قرآن اپنے ہر پڑھنے والے کو مسلسل دیتا ہے کہ لذات دنیوی اور تعیش و تنعم سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ اپنی ضروریات کو کم سے کم کرو، اور حقیقی اور واقعی ضروریات سے جو بھی زائد ہو اسے اللہ کی راہ میں دے دو اور یہ نہ سمجھو کہ مال میں واحد حق زکوٰۃ ہی ہے۔ یہ تو کم از کم اور ناگزیر قانونی ضابطہ ہے۔ ایمان کا اصل تقاضہ و مطالبہ اس سے بہت آگے ہے۔ بموجب فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "فِی الْمَالِ حَقٌّ سِوَی الزَّکَاۃِ" مال میں زکواۃ کے علاوہ بھی بہت سے حقوق ہیں۔۔۔ اور اچھی طرح جان لیجئے کہ نظامِ اسلامی کا اصل حسن و جمال اور اس کی اصل برکات اس کی اسی دوسری اور تکمیلی تعلیم و تلقین میں مضمر ہیں!!۔۔۔

اسلامی نظم مملکت میں نظامِ محاصل کے بارے میں ایک اہم اور اصولی بات اور بھی ہے جو مدِ نظر رہنی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ریاست اصلاً ایک نظریاتی ریاست ہے اور اگرچہ اس کی حدود میں بسنے والے تمام شہری بلا امتیاز مذہب و ملت بعض اعتبارات سے بالکل مساوی بھی ہیں جیسے حُرمتِ جان و مال میں تاہم بہت سے اعتبارات سے شہریوں کا دو حصوں میں منقسم ہونا لازم و لابد ہے۔ یعنی ایک وہ جو اس نظریئے کو ماننے والے ہوں جس پر ریاست قائم ہے اور دوسرے وہ جو اسے نہ مانتے ہوں۔۔۔، چنانچہ اسلام کے نظامِ محاصل کے اعتبار سے بھی ایک اہم اور بنیادی تقسیم اسی اعتبار سے ہے کہ بعض کی ادائیگی صرف مسلمانوں پر ہے یعنی اسلامی ریاست کے اصول و مبادی کے ماننے والوں پر اور بعض کی غیر مسلموں پر یعنی ان پر جو ان اصولوں کو نہیں مانتے، پھر یہ کہ ان دونوں کی نوعیت میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان کے مداتِ صَرف میں بھی اساسی اور بنیادی فرق ہے۔

چنانچہ مسلمانوں سے نقدی کی تمام صورتوں اور اموالِ تجارت پر زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے جس کی شرح کُل مالیت کا ۲½ فی صد ہے، ان کی زرعی اراضی میں سے نہری یا چاہی زمینوں کی کل پیداوار کا بیسواں حصّہ وصول کیا جاتا ہے یعنی ۵ فی صد۔۔۔ اور بارانی زمینوں کی پیداوار سے کُل کا دسواں حصّہ وصول کیا جاتا ہے یعنی دس فی صد۔۔۔۔ اور ان دونوں کی نوعیت ٹیکس کی نہیں ہے بلکہ اصلاً عبادت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شرح

© rasailojaraid.com

بھی بالکل معیّن ہے جس میں کسی ردّ و بدل کی گنجائش نہیں ہے، ورنہ ان کی حیثیت عبادت کی نہیں رہے گی بلکہ صرف ایک Tax کی رہ جائے گی۔ اسی طرح ان کی مدّاتِ صَرف بھی معیّن ہیں، ان کے علاوہ کسی مَد میں انہیں صرف نہیں کیا جا سکتا۔ جن کا مجموعی حاصل وہ اجتماعی ضمانت یا سماجی تحفظ ہے جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے!

اس کے برعکس غیر مسلموں کے اموال سے **جزیہ** وصول کیا جاتا ہے اور ان کی زمینوں سے '**خراج**' اور ان دونوں کی حیثیت خالصتًہ Tax کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی شرح بھی معیّن نہیں، ان کا تعیّن حکومتِ وقت کی صوابدید پر ہے اور اسی طرح ان سے حاصل شدہ رقوم کے صرف پر بھی کوئی پابندی نہیں، جملہ شعبہ ہائے حکومت کے اخراجات اور نظم و نسق مملکت کے تمام تقاضے ان سے پورے کئے جا سکتے ہیں[1]

اسلامی حکومت کی آمدنی کا ایک اور شعبہ جس کی شرح معیّن ہے، وہ اموالِ خُمس ہیں یعنی پانچواں حصہ یا بیس فی صد جو اموال **غنیمت**، **کنز** یعنی دفینے، اور رکاز یعنی معدنیات سے وصول کیا جاتا ہے۔ ان کی جس طرح شرح وصولی زکوٰۃ و عشر کی طرح

---

[1] ایک نہایت اہم اور فوری اور فقہ حنفی کی رو سے نہایت محکم رائے یہ بھی ہے کہ پاکستان کی جملہ اراضی 'خراجی' کے حکم میں ہیں نہ کہ 'عُشری' کے حکم میں، گویا اگر امام ابوحنیفہ رح کی مزارعت کے مطلقًا حرام ہونے کی رائے کو کسی وجہ سے چھوڑ کر صاحبین یعنی قاضی ابویوسف رح اور امام محمد شیبانی رح کی رائے پر عمل کیا جائے تو بھی پاکستان کی جملہ اراضی کے کاشت کار براہِ راست ریاست پاکستان کے 'مزارع' ہوں گے اور ان کا "خراج" براہِ راست خزانہ عامرہ میں جمع ہوگا — جس سے TAXATION کے پورے نظام میں انقلاب آجائے گا — اور غالبًا انکم ٹیکس کی تو سِرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس موضوع پر پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کی ایک مختصر تحریر اس کتابچہ کے آخر میں درج کی جا رہی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے بعض نظریات کی بنا پر ہمارے دینی حلقوں میں شدید متنازعہ، شخصیت بن چکے ہیں لیکن ہمیں تو ہدایت ہے کہ "انظروا الیٰ ما قال ولا تنظروا الیٰ من قال" — یعنی یہ دیکھو کہ کہا کیا جا رہا ہے، اسے نظر انداز کر دو کہ کہنے والا کون ہے! لہٰذا اس معاملے میں ان کی رائے پر جملہ اہلِ علم کو غور کرنا چاہئیے۔
(اسرار احمد)

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

معیّن ہے اس طرح مدّاتِ صَرف بھی صرف وہی ہیں جو زکوٰۃ اور عشر کی ۔ اس فہرست میں صرف ایک اور شق کا اگر اضافہ کر لیا جائے تو ایک پہلو سے بات مکمل ہو جائے گی اور وہ یہ کہ نہ زکوٰۃ اور عُشر کے علاوہ جو صدقاتِ نافلہ مسلمان اپنی مرضی سے فی سبیل اللہ دیں اُن کے بارے میں انہیں اختیار ہے کہ چاہے از خود فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیں چاہے اسلامی حکومت کے حوالے کر دیں (بخلاف زکوٰۃ اور عُشر کے کہ وہ لازماً حکومت ہی کو ادا کرنے ہوں گے!) اگر وہ ایسی رقوم بھی حکومت کے حوالے کر دیں تو وہ بھی صرف ان ہی مدّات میں صرف ہوں گی جن میں زکوٰۃ اور عشر کی رقوم کا صَرف جائز ہے ۔

اس کے بعد نمبر آتا ہے اسلامی حکومت کے عام محاصل کا جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱ ۔ فَے یعنی وہ اموال جو غیر مسلموں سے جنگ کے سوا کسی اور طریق سے حاصل ہوں۔ اپنی اصل کے اعتبار سے جزیہ اور خراج بھی فے ہی کی قسمیں ہیں، لیکن عرفِ عام میں یہ لفظ ان اموال پر بولا جاتا ہے جو حاصل تو متحارب غیر مسلموں (یعنی Hostile non-Muslims) سے ہوئے ہوں لیکن اُن میں فی الواقع جنگ اور خونریزی کی نوبت نہ آئی ہو ۔

۲ ۔ کراء الارض یعنی حکومت کی مملوکہ اراضی سے حاصل شدہ لگان ۔

عُشور یا درآمدی و برآمدی محصولات جن کے بارے میں ایک زمانے میں شرح کا تعین کچھ اس طرح ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے اموال میں سے ۲½ فیصد اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہریوں یعنی ذمیوں کے اموال میں سے پانچ فیصد اور دوسرے غیر مسلموں سے دس فی صد لیا جاتا تھا۔ لیکن یہ شرحیں کسی نص پر مبنی نہیں ہیں اور ان میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے جس میں ظاہر ہے درآمد و برآمد کے کاروبار کا توازن اور عالمی منڈی کے اتار چڑھاؤ کو اصل دخل حاصل ہوگا!

۴ ۔ ضرائب یعنی وہ مزید Tax جو حکومت حسبِ ضرورت شہریوں پر عاید کر سکتی ہے۔ عام حالات میں بھی اگر دفاع اور نظم مملکت کی ضروریات اور فقراء کی احتیاجات مندرجہ بالا تمام مدّوں سے پوری نہ ہو رہی ہوں اور ہنگامی حالات میں بھی جیسے زمانہ جنگ یا قحط سالی یا کسی عمومی

© rasailojaraid.com

DEPRESSION کے باعث عام بے روزگاری وغیرہ ۔ ایسی خاص صورتوں میں اسلامی حکومت کو اغنیاء پر Tax لگانے کا غیر محدود اختیار حاصل ہے ۔

۵۔ اموالِ فاضلہ

یعنی متفرق آمدنی جیسے کوئی شہری اگر لاوارث فوت ہو تو اس کی کل جائیداد اسلامی حکومت کی ملکیت قرار پاتی ہے ، اسی طرح کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کا کل مال بھی بیت المال میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر کوئی غیر مسلم شہری بغاوت کا مرتکب ہو جائے تو اُس کی کُل میراث بھی اسلامی حکومت کا حق ہے ۔

۶۔ اوقاف

وقف اگر کسی خاص مقصد اور متعیّن مقصد کے لیے ہوں تو ان کی آمدن انہی مصارف پر خرچ ہوگی ، لیکن اگر کوئی شہری عام فی سبیل اللہ وقف کرتا ہے تو گویا وہ اسلامی حکومت کی ملکیت شمار ہوگا اور اس کی کل آمدنی بیت المال میں شامل کی جائے گی ۔ ان میں سے فئے ، اموال فاضلہ اور عام اوقاف تو کُل کے کل بیت المال میں داخل ہوں گے ، البتہ ان کے ضمن میں کسی شرح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ البتہ کراء الارض ، ضرائب اور عشور کی حیثیت Taxes کی ہے اور ان کی شرح وقتاً فوقتاً تبدیل کی جاسکتی ہے جیسے بھی ضرورت داعی ہو ۔۔ اسی طرح ان کے حاصل شدہ آمدنی کے صَرف پر بھی کوئی پابندی نہیں ۔ یہ انتظام مملکت کے اخراجات اور رفاہ عامہ ، عمومی فلاح وبہبود اور Public works سب پر خرچ کی جاسکتی ہے ۔ اگرچہ ایک رائے یہ ہے کہ ضرائب اور عشور میں سے بھی جو رقوم مسلمانوں سے حاصل ہوں گی ان کی مدّاتِ صَرف بھی وہی ہوں گی جو زکوٰۃ ، عشر اور صدقات کی ہیں ۔

اس تفصیل سے ایک جانب تو وہ حقیقت بالکل مبرہن ہو گئی جو پہلے عرض کی جاچکی ہے یعنی یہ کہ اسلامی نظم مملکت میں Taxation کے اعتبار سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین بڑا بنیادی فرق ہے اور یہ فرق فطری بھی ہے اور عقلی و منطقی بھی اس لیے کہ ایک غیر مسلم کے لیے اسلامی حکومت بس ایک امن و امان اور نظم و نسق قائم رکھنے والے ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اور بس ! جبکہ ایک مسلمان کے نزدیک اسلامی حکومت زمین پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول صلیّ اللہ علیہ وسلّم کی نمائندہ ہوتی ہے

© rasailojaraid.com

اور اس کا مقصد صرف دنیوی فلاح و بہبود ہی نہیں ہوتا اخروی فوز و فلاح بھی ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قائم ہی ہوتی ہے ۔ نظریۂ اسلامی کی ترویج و اشاعت اور دنیا میں اسلام کی تبلیغ اور غلبۂ و اقامت کے لیے ۔ اس لیے اس کی خیر خواہی و وفاداری اور اس کا بقاء و استحکام مسلمان کے عین دین و مذہب کا تقاضا ہے ۔ چنانچہ وہ اس کو اپنی کمائی یا اللہ کے فضل میں سے جو کچھ دیتا ہے اسے عبادت سمجھ کر دیتا ہے۔ اُس کے اس تصور کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے کہ ان کی فرضیت اور شرح ادائیگی اللہ اور اس کے رسُول کی طرف سے ہیں، حکومت وقت صرف جمع کرنے والی یعنی (Collector) اور تقسیم کرنے والی یعنی (Distributor) ہے نہ کہ عاید کرنے والی اور عدم ادائیگی یا ادائیگی میں کتمان و فریب صرف قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں ہے بلکہ گناہ اور معصیت ہے جس کا وبال ابدی اخروی زندگی میں بھگتنا پڑے گا ۔

دوسری حقیقت یہ بھی واضح ہو گئی کہ مسلمان شہریوں سے اسلامی حکومت کو جو کچھ وصُول ہو اس میں سے اکثر کا اوّلین مصرف اس خلیج کو پاٹنا ہے جو اسلام کے قانونی و فقہی نظام میں موجود آزاد معیشت کا لازمی نتیجہ ہے خواہ وہ کم ہو یا بیش !

تیسری اہم حقیقت جو دنیا کے دوسرے اکثر نظام ہائے Taxation سے مختلف ہے ۔ وہ یہ کہ اسلام کا غالب رجحان یہ ہے کہ Tax کے لیے اساس و بنیاد نہ فرد بحیثیت فرد ہو جس پر Poll یا Capitation tax عاید کیا جاتا ہے، ـــــ نہ آمدنی ہو جس پر Income tax کی بنیاد ہے، نہ وسعت خرچ یا Capacity to spend ہو بلکہ کُل پیداوار یا ملکیت یعنی (Total produce or possession) ہو ۔ ـــــ جیسا کہ زکوٰۃ یا عشر یا خمس سے ظاہر ہوتا ہے ۔ TAX عاید کرنے کی ان دوسری اساسات کے مقابلے میں اسلام کی اختیار کردہ یہ اساس کن مصلحتوں پر مبنی ہے ۔ یہ ایک دقیق فنی مسئلہ ہے، تاہم اس ضمن میں ایک کوشش تو سید نزہت بخاری صاحب نے اپنے اس مقالے میں کی ہے جس کا ذکر میں آغاز میں بطور لطیفہ کر چکا ہوں ۔ ان کی تحقیق کا لبّ لباب یہ ہے کہ Income tax عاید کرنے سے افراطِ زر یا Inflation کا رجحان بڑھتا ہے جبکہ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

، Total produce or possession ، پر ٹیکس عاید کرنے سے اس کا قلع قمع ہوتا ہے۔ میں ایک غیر فنی انسان کی حیثیت سے ان کی دلیل کو پورے طور پر سمجھ نہیں پایا، تاہم یہ ایک اہم خیال ہے جو ایک واقفِ حال شخص نے ظاہر کیا ہے اس پر توجہ دی جانی چاہیے۔

میرے سامنے ایک عامی کی حیثیت سے اس کی ایک دوسری اور عظیم تر مصلحت آئی ہے اور وہ یہ کہ آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا "لانا ہے جوئے شیر کا" کا مصداق ہے۔ اور اس کے لیے بہت لمبے چوڑے اور Elaborate accounting کی ضرورت ہے جبکہ اسلام کے نظام محاصل میں سے اکثر کے لیے اس کی کوئی حاجت نہیں رہتی۔ اب ظاہر ہے کہ بڑے بڑے شراکتی اداروں یا Limited companies کے لیے تو تفصیلی حساب کتاب ویسے بھی ناگزیر ہے تاکہ حصہ داروں کے مابین منافع کی تقسیم منصفانہ ہو سکے اور اگر یہ ادارے اپنے Size کے اعتبار سے اس Accounting پر زر کثیر صرف کریں تو کوئی زیادہ بار بھی نہ ہوگا۔ لیکن آبادی کی عظیم اکثریت جو چھوٹے چھوٹے کاروبار لئے بیٹھی ہے اس کے لیے حساب کتاب کا یہ معاملہ خالص دردِ سر بھی ہے اور محض ضیاع بھی۔ یہ معاملہ چھوٹے چھوٹے دوکانداروں ہی کا نہیں ہے۔ ہمارے درمیانی طبقے کی عظیم اکثریت کا ہے۔ آپ ایک ڈاکٹر کا تصور کریں جو روزانہ اوسطاً سو ڈیڑھ سو مریض دیکھتا ہے، اب اگر وہ اپنی آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا چاہے اور وہ بھی ایسا جو انکم ٹیکس آفیسر کے نزدیک 'قابلِ تصدیق' ہو تو اسے ہر مریض کا نام اور اس کو روزانہ دی جانے والی ادویات کی تفصیل کے علاوہ ادویات کی خرید و فروخت کا پورا حساب اور ان کا مکمل سٹاک اکاؤنٹ رکھنا ضروری ہوگا جس کے لئے ایک کلرک اور ایک اکاؤنٹنٹ کی خدمات لازمی ہیں ــــــ اور ان سب پر جو خرچ آئے گا وہ خالص Non-productive ہوگا۔ وقِس علیٰ ذالک۔

اس کے برعکس اسلام کے نظام محاصل میں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص سال کے آخر میں اپنی مالی حالت کا حساب بآسانی کر سکتا ہے اور اس پر زکواۃ ادا کر سکتا ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہِ ربّ العٰلمین ۝

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com